نایافت

احمد فراز



Dost

نایافت

احمد فراز

دوست پبلی کیشنز - اسلام آباد

ضابطہ

ISBN : 969-496-079-7

کتاب	:	نایافت
شاعر	:	احمد فراز
موسم اشاعت	:	۱۹۹۸ء
سرورق	:	اے شہزاد
مطبع	:	الساجد پرنٹرز
قیمت	:	110.00 روپے

دوست پبلی کیشنز 8 اے، خیابان سہروردی، پوسٹ بکس نمبر 2958، اسلام آباد۔

دیباچہ

یہ قصّہ پُرانا ہے
جب بعض ہونٹوں نے چاہا
کہ لفظوں کو آواز کی زندگی دیں
تو خود اُن کو زہراب پینا پڑا تھا
کہ اہلِ حکم کو یہ ڈر تھا
یہ الفاظ
آواز کی زندگی سے
کوئی داستاں بن نہ جائیں

..... اور وہ ہونٹ چپ ہو گئے تھے
سسکتے تڑپتے ہوئے لفظ
قاتل کی شمشیر سے نیم جاں
مدتوں تک فراقِ صدا میں
دھڑکتے رہے ہیں

کسے کیا خبر تھی
کہ ان بسملوں کا لہو ..... قطرہ قطرہ
لکیروں کی صورت دمکتا رہے گا
اور اب یہ
لہو کی لکیریں
بجائے خود اک داستاں بن گئی ہیں

○

ہُوئی ہے شام تو آنکھوں میں بس گیا پھر تُو
کہاں گیا ہے مرے شہر کے مسافر تُو

مری مثال کہ اک نخلِ خشکِ صحرا ہوں
ترا خیال کہ شاخِ چمن کا طائر تُو

میں جانتا ہوں کہ دنیا تجھے بدل دے گی
میں مانتا ہوں کہ ایسا نہیں بظاہر تُو

ہنسی خوشی سے بچھڑ جا اگر بچھڑنا ہے
یہ ہر مقام پہ کیا سوچتا ہے آخر تُو

فضا اُداس ہے رُت مضمحل ہے میں چپ ہوں
جو ہو سکے تو چلا آ کسی کی خاطر تو

فراز تُو نے اُسے مشکلوں میں ڈال دیا
زمانہ صاحبِ زر اور صرف شاعر تو

عجیب رُت تھی کہ ہر چند پاس تھا وہ بھی
بہت ملول تھا میں بھی اُداس تھا وہ بھی

کسی کے شہر میں کی گفتگو ہواؤں سے
یہ سوچ کر کہ کہیں آس پاس تھا وہ بھی

ہم اپنے زعم میں خوش تھے کہ اُس کو بھول چکے
مگر گمان تھا یہ بھی قیاس تھا وہ بھی

کہاں کا اب غمِ دنیا کہاں کا اب غمِ جاں
وہ دن بھی تھے کہ ہمیں یہ بھی راس تھا وہ بھی

فراز تیرے گریباں پہ کل جو ہنستا تھا
اُسے ملے تو دریدہ لباس تھا وہ بھی

عقیدت

*

میں کتنی وارفتگی سے اُس کو سُنا رہا تھا
وہ ساری باتیں وہ سارے قصّے
جو اس سے ملنے سے پیشتر
میری زندگی کی حکایتیں تھیں

میں کہہ رہا تھا
کہ اور بھی لوگ تھے
جنھیں میری آرزو تھی مری طلب تھی

کہ جن سے میری محبتوں کا رہا تعلق
کہ جن کی مجھ پر عنایتیں تھیں

میں کہہ رہا تھا
کہ اُن میں کچھ کو تو میں نے
جاں سے عزیز جانا
مگر اُنھیں میں سے بعض کو
میری بے دلی سے شکایتیں تھیں

میں ایک اک بات
ایک اک جرم کی کہانی
دھڑکتے دل کانپتے بدن سے سُنا رہا تھا
مگر وہ پتّھر بنی
مجھے اِس طرح سے سُنتی رہی
کہ جیسے مرے لبوں پر
کسی مقدّس ترین صحیفے کی آیتیں تھیں

سچ کا زہر

تجھے خبر بھی نہیں
کہ تیری اُداس ادھوری
محبتوں کی کہانیاں
جو بڑی کشادہ دلی سے
ہنس ہنس کے سُن رہا تھا
وہ شخص تیری صداقتوں پر فریفتہ
باوفا و ثابت قدم

کہ جس کی جبیں پہ
ظالم رقابتوں کی جلن سے
کوئی شکن نہ آئی
وہ ضبط کی کربناک شدت سے
دل ہی دل میں
خموش، چُپ چاپ
مر گیا ہے

⊙

ہر آشنا میں کہاں خوئے محرمانہ وہ
کہ بے وفا تھا مگر دوست تھا پرانا وہ

کہاں سے لائیں اب آنکھیں اُسے کہ رکھتا تھا
عداوتوں میں بھی انداز مخلصانہ وہ

جو ابر تھا تو اُسے ٹوٹ کر برسنا تھا
یہ کیا کہ آگ لگا کر ہُوا روانہ وہ

پکارتے ہیں مہ و سال منزلوں کی طرح
لگا ہے توسنِ ہستی کو تازیانہ وہ

ہمیں بھی غم طلبی کا نہیں رہا یارا
ترے بھی رنگ نہیں گردشِ زمانہ وہ

اب اپنی خواہشیں کیا کیا اُسے رُلاتی ہیں
یہ بات ہم نے کہی تھی مگر نہ مانا وہ

یہی کہیں گے کہ بس صورت آشنائی تھی
جو عہد ٹوٹ گیا یاد کیا دلانا وہ

اس ایک شکل میں کیا کیا نہ صورتیں دیکھیں
نگار تھا، نظر آیا نگارخانہ وہ

فراز خواب سی دُنیا دکھائی دیتی ہے
جو لوگ جانِ جہاں تھے ہُوئے فسانہ وہ

⊙

تیرے قریب آ کے بڑی اُلجھنوں میں ہُوں
میں دشمنوں میں ہوں کہ ترے دوستوں میں ہُوں

مجھ سے گریز پا ہے تو ہر راستہ بدل
میں سنگِ راہ ہوں تو سبھی راستوں میں ہُوں

تو آ چکا ہے سطح پہ کب سے خبر نہیں
بے درد میں ابھی انھیں گہرائیوں میں ہُوں

اے یارِ خوش دیار تجھے کیا خبر کہ میں
کب سے اُداسیوں کے گھنے جنگلوں میں ہُوں

تو لُوٹ کر بھی اہلِ تمنا کو خوش نہیں
میں لُٹ کے بھی وفا کے انہی قافلوں میں ہُوں

بدلا نہ میرے بعد بھی موضوعِ گفتگو
میں جا چکا ہوں پھر بھی تری محفلوں میں ہوں

مجھ سے بچھڑ کے تو بھی تو روئے گا عمر بھر
یہ سوچ لے کہ میں بھی تری خواہشوں میں ہوں

تو ہنس رہا ہے مجھ پہ مرا حال دیکھ کر
اور پھر بھی میں شریک ترے قہقہوں میں ہوں

خود ہی مثالِ لالۂ صحرا لہو لہو
اور خود فرازؔ اپنے تماشائیوں میں ہُوں

تخلیق

درد کی آگ بجھا دو کہ ابھی وقت نہیں
زخمِ دل جاگ سکے نشترِ غم رقص کرے
جو بھی سانسوں میں گھُلا ہے اُسے عریاں نہ کرو
چپ بھی شعلہ ہے مگر کوئی نہ الزام دھرے

ایسے الزام کہ خود اپنے تراشے ہُوئے بُت
جذبۂ کاوشِ خالق کو نگونسار کریں
مُو قلم حلقۂ ابرو کو بنا دے خنجر
لفظ نوحوں میں رقمِ مدحِ رخِ یار کریں
رقصِ مینا سے اُٹھے نغمۂ رقصِ بسمل
ساز خود اپنے مغنّی کو گنہگار کریں

مرہمِ اشک نہیں زخمِ طلب کا چارہ
خوں بھی روؤ گے تو کس خاک کی سج دھج ہوگی
کانپتے ہاتھوں سے ٹوٹی ہُوئی بنیادوں پر
جو بھی دیوار اُٹھاؤ گے وہی کج ہوگی
کوئی پتّھر ہو کہ نغمہ کوئی پیکر ہو کہ رنگ
جو بھی تصویر بناؤ گے اپاہج ہوگی

یہ کیسی رُت ہے

یہ کیسی رُت ہے
کہ ہر شجر
صحنِ گلستاں میں
ملول و تنہا سلگ رہا ہے
طیور چپ چاپ کب سے منقار زیرِ پر ہیں
ہوائیں نوحہ کناں
کہ اس باغ کی بہاریں
گئیں، تو پھر لوٹ کر نہ آئیں

یہ کیسی رُت ہے
نہ برف باری کے دن
کہ شاخوں کے پیرہن پر
سپیدۂ صبح کا گماں ہو
نہ فصلِ گُل ہے
کہ ہر طرف شورِ جانفروشاں سے
کوئے محبوب کا سماں ہو
نہ دورِ پت جھڑ کا ہے
کہ بے جان کونپلوں کو
اُمیدِ فردائے مہرباں ہو

یہ کیسی رُت ہے
کوئی تو بولے
کوئی تو دھڑکے
کوئی تو بھڑکے۔

آنکھ سے دُور نہ ہو دل سے اُتر جائے گا
وقت کا کیا ہے گزرتا ہے گزر جائے گا

اتنا مانوس نہ ہو خلوتِ غم سے اپنی
تو کبھی خود کو بھی دیکھے گا تو ڈر جائے گا

ڈوبتے ڈوبتے کشتی کو اُچھالا دے دوں
میں نہیں کوئی تو ساحل پہ اُتر جائے گا

زندگی تیری عطا ہے تو یہ جانے والا
تیری بخشش تری دہلیز پہ دھر جائے گا

ضبط لازم ہے مگر دُکھ ہے قیامت کا فرازؔ
ظالم اب کے بھی نہ روئے گا تو مر جائے گا

اب شوق سے کہ جاں سے گزر جانا چاہیے
بول اے ہوائے شہر! کدھر جانا چاہیے

کب تک اُسی کو آخری منزل کہیں گے ہم
کوئے مراد سے بھی اُدھر جانا چاہیے

وہ وقت آگیا ہے کہ ساحل کو چھوڑ کر
گہرے سمندروں میں اُتر جانا چاہیے

اب رفتگاں کی بات نہیں کارواں کی ہے
جس سمت بھی ہو گردِ سفر جانا چاہیے

کچھ تو ثبوتِ خونِ تمنّا کہیں ملے
ہے دل تہی تو آنکھ کو بھر جانا چاہیے

یا اپنی خواہشوں کو مقدّس نہ جانتے
یا خواہشوں کے ساتھ ہی مر جانا چاہیے

گئی رُت

پھر آ گئی ہے، گئی رُت تمھیں خبر بھی نہیں
خبر مجھے بھی نہیں تھی کہ رات پچھلے پہر
کسی نے مجھ سے کہا جاگ اے دریدہ جگر
نشستہ ہے سرِ دہلیز کوئی بام نشیں

بدل چکا تھا سبھی کچھ تمہارے جاتے ہی
فلک کا چاند، زمیں کے گلاب راکھ ہوئے
وہ راکھ خواب ہوئی پھر وہ خواب راکھ ہوئے
تم آسکو تو میں سمجھوں تمہارے آتے ہی

ہر ایک نقش وہی آج بھی ہے جو کل تھا
یہ راکھ خواب بنے خواب سے گلاب بنے
ہر اک ستارۂ مژگاں سے مہتاب بنے
برس فراق کا جیسے وصال کا پل تھا

کردار

ہم ابھی ایستادہ تھے
اب سے کچھ پہلے
وفا کے فرش پائیدہ پہ
خوش وقتی کے رنگیں شامیانوں کے تلے
اپنے ہاتھوں میں قرار و قول کی شمعیں لیے
آندھیوں میں زلزلوں میں
تا قیامت ساتھ دینے کے لیے
آمادہ تھے
اک دوسرے کے اس قدر دلدادہ تھے

دیکھنے والوں میں شامل
یار بھی اغیار بھی
چند آنکھوں میں نمی
چند آنکھوں میں حقارت، برہمی
چند آنکھوں میں سکوتِ دائمی
جم گئے سائے اُدھر
اور کانپ اُٹھی اس طرف دیوار بھی
دشمنوں کو بھی یقیں
اور بدگماں کچھ ہمنشیں — غمخوار بھی
دیکھنے والوں نے دیکھا

کس طرح صدیاں اچانک
ثانیوں میں بٹ گئیں
شامیانوں کی طنابیں کٹ گئیں

بجھ گئیں شمعیں قرار و قول کی
فرشِ وفا کی سخت و پائندہ سلیں بھی پھٹ گئیں
اور دو پیکر
خود اپنے خنجروں کے وار سے
خاک و خوں میں تربتر
فرش پر افتادہ تھے
ہم ابھی استادہ تھے

نظر بجھی تو کرشمے بھی روز و شب کے گئے
کہ اب تلک نہیں آئے ہیں لوگ جب کے گئے

سنے گا کون تری بے وفائیوں کا گلہ
یہی ہے رسمِ زمانہ تو ہم بھی اب کے گئے

مگر کسی نے ہمیں ہم سفر نہیں جانا
یہ اور بات کہ ہم ساتھ سب کے گئے

اب آئے ہو تو یہاں کیا ہے دیکھنے کے لیے
یہ شہر کب سے ہے ویراں وہ لوگ کب کے گئے

گرفتہ دل تھے، مگر حوصلہ نہ ہارا تھا
گرفتہ دل ہیں، مگر حوصلے بھی اب کے گئے

تم اپنی شمعِ تمنا کو رو رہے ہو فراز
ان آندھیوں میں تو پیارے چراغ سب کے گئے

روز نا جرمن نژاد

روز نا جرمن نژاد
اس کے ہونٹوں میں حرارت
جسم میں طوفاں
برہنہ پنڈلیوں میں آگ
نیّت میں فساد
رنگ و نسل و قامت و قد
سرزمین و دین کے سب تفرقوں سے بے نیاز

ہر کسی سے بے تکلف ایک حد تک دلنواز
وہ سبھی کی ہم پیالہ ہم نفس
عمر شاید بیس سے اُوپر برس یا دو برس

روز نا جرمن نژاد
اور دیکھنے والوں میں سب
اس کی آسودہ نگاہی بے محابا میگساری کے سبب
پیکرِ تسلیم و سرتاپا طلب
ان میں ہر اک کی متاعِ کُل
بہائے التفاتِ نیمِ شب

روز نا جرمن نژاد
اور اس کا دل زخموں سے چُور
اپنے ہمدردوں سے ہمسایوں سے دُور

گھر کی دیواریں نہ دیواروں کے سایوں کا سرور
جنگ کے آتشکدے کا رزق کب سے بن چکا
ہر آہنی بازو کا خوں
ہر چاند سے چہرے کا نور

خلوتیں خاموش و ویراں
اور ہر دہلیز پر اک مضطرب مرمر کا بُت
ایستادہ ہے بچشمِ ناصبور
کون ہے اپنوں میں باقی
توسنِ راہِ طلب کا شہسوار
ہر دریچے کا مقدّر انتظار

اجنبی مہماں کی دستکِ خواب
شاید خواب کی تعبیر بھی

چند لمحوں کی رفاقت جاوداں بھی
حسرتِ تعمیر بھی
الوداعی شام، آنسو، عہد و پیماں
مضطربِ صیّاد بھی نخچیر بھی
کون کر سکتا ہے ورنہ ہجر کے کالے سمندر کو عبور
اجنبی مہماں کا اک حرفِ وفا

نومید چاہت کا غرور
روز نا اب اجنبی کے ملک میں خود اجنبی
پھر بھی چہرے پر اُداسی ہے نہ آنکھوں میں تھکن
اجنبی کا ملک جس میں چار سُو
تاریکیاں ہی خیمہ زن
سب کے سایوں سے بدن
روز نا مرمر کا بُت

اور اس کے گرد
ناچتے سائے بہت
سب کے ہونٹوں پر وہی حرفِ وفا
ایک سی سب کی صدا
وہ سبھی کی ہم پیالہ ہم نفس
عمر شائد بیس سے اُوپر برس یا دو برس
اس آنکھوں میں تجسس اور بس

○

بدن میں آگ ہے چہرہ گلاب جیسا ہے
کہ زہرِ غم کا نشہ بھی شراب جیسا ہے

وہ سامنے ہے مگر تشنگی نہیں جاتی
یہ کیا ستم ہے کہ دریا سراب جیسا ہے

کہاں وہ قُرب کہ اب تو یہ حال ہے جیسے
ترے فراق کا عالم بھی خواب جیسا ہے

مگر کبھی کوئی دیکھے کوئی پڑھے تو سہی
دل آئنہ ہے تو چہرہ گلاب جیسا ہے

بہارِ خوں سے چمن زار بن گئے مقتل
جو نخلِ دار ہے شاخِ گلاب جیسا ہے

فرازؔ سنگِ ملامت سے زخم زخم سہی
ہمیں عزیز ہے خانہ خراب جیسا ہے

فضا نورد بادل

میں سایۂ نخل میں کھڑا تھا
جب ایک فضا نورد بادل
لہراتا ہُوا نظر پڑا تھا

یوں قلب و جگر سے آگ اُٹھی
برسوں کی طویل تشنہ کامی
یکلخت ہی جیسے جاگ اُٹھی

پل بھر میں بدن دہک رہا تھا
میں سایۂ نخل سے نکل کر
بادل کی طرف لپک رہا تھا

بادل بھی سمندروں کا پیاسا
یہ اس کا کرم کہ چند لمحے
وہ مجھ کو بھی دے گیا دلاسا

دل پر لیے داغِ نامرادی
چاہا کہ پلٹ چلوں ادھر ہی
جس سمت سے درد نے صدا دی

دیکھا تو رُت بھی جا چکی تھی
مایوس کن انتظار کی دھوپ
اس نخلِ وفا کو کھا چکی تھی

کہا تھا کس نے تجھے آبرو گنوانے جا
فراز اور اُسے حالِ دل سنانے جا

کل اک فقیر نے کس سادگی سے مجھ سے کہا
تری جبیں کو بھی ترسیں گے آستانے جا

اُسے بھی ہم نے گنوایا تری خوشی کے لیے
تجھے بھی دیکھ لیا ہے ارے زمانے جا

بہت ہے دولتِ پندار پھر بھی دیوانے
جو تجھ سے رُوٹھ چکا ہے اُسے منانے جا

سُنا ہے اُس نے سوئمبر کی رسم تازہ کی
فراز تو بھی مقدر کو آزمانے جا

○

نہ اب جواز نہ موقع ہے ہاتھ ملنے کا
ہمی کو شوق رہا راستے بدلنے کا

پہنچ گئے سرِ منزل بخوبیٔ قسمت
مگر وہ لطف کہاں ساتھ ساتھ چلنے کا

میں آپ اپنے ہی پندار کے حصار میں ہوں
بجز شکست کہاں راستہ نکلنے کا

وہ ساعتیں تو ہواؤں کے ساتھ جا بھی چکیں
نظر میں اب بھی ہے منظر چراغ جلنے کا

وہ سرد مہر سہی پر نگاہِ لطف کے بعد
فراز دیکھ سماں برف کے پگھلنے کا

فصلِ رائیگاں

زندگی کے خواب فصلِ رائیگاں
تو دریدہ دل میں آشفتہ بیاں
زندگی کے خواب فصلِ رائیگاں

رائیگاں ہر درد کے سورج کی دھوپ
آبلے ہاتھوں کے ماتھوں کا عرق
گیسوؤں کے ابر ہونٹوں کی شفق
میرے دل کی آگ تیرا رنگ روپ

رائیگاں خونِ وفا کی ندیاں
کشتِ بے حاصل کا حاصل بے نشاں

آنسوؤں کی جھیل دوپہروں کی لُو
جسم شل احساس مردہ دل لہو

چار جانب ریت کے ٹیلے رواں
کوئی نوحہ گر نہ کوئی چشم نم
صرف ہم تو بھی کہاں میں بھی کہاں
جیسے ویرانے میں لاشیں بے اماں

بے کفن، بے گور، رزقِ کرگساں
اور یہ یادیں بھی کچھ لمحوں کی ہیں
جس طرح صحرا میں قدموں کے نشاں
جس طرح تعزیتی خاموشیاں

سلامتی کونسل

پھر چلے ہیں مرے زخموں کا مداوا کرنے
میرے غمخوار اُسی فتنہ گرِ دہر کے پاس
جس کی دہلیز پہ ٹپکی ہیں لہو کی بوندیں
جب بھی پہنچا ہے کوئی سوختہ جاں کشتۂ یاس
جس کے ایوانِ عدالت میں فروکش قاتل
بزم آرا و سخن گستر و فرخندہ لباس
ہر گھڑی نعرہ زناں "امن و مساوات کی خیر"
زر کی میزان میں رکھے ہوئے انسان کا ماس

کون اس قتل گہہِ ناز کے سمجھے اسرار
جس نے ہر دشنہ کو پھولوں میں چھپا رکھا ہے
امن کی فاختہ اُڑتی ہے نشاں پر لیکن
نسلِ انساں کو صلیبوں پہ چڑھا رکھا ہے
اس طرف نطق کی بارانِ کرم اور ادھر
کاسۂ سر سے مناروں کو سجا رکھا ہے

جب بھی آیا ہے کوئی کشتۂ بیداد اُسے
مرہمِ وعدۂ فردا کے سوا کچھ نہ ملا
یہاں قاتل کے طرفدار ہیں سارے قاتل
کاہشِ دیدۂ پُرخوں کا صلہ کچھ نہ ملا
کاشمیر کوریا ویت نام دومنکن کانگو
کسی بسمل کو بجز حرفِ دعا کچھ نہ ملا

قصرِ انصاف کی زنجیر ہلانے والو
کجکلاہوں پہ قیامت کا نشہ ہے طاری
اپنی شمشیر پہ کشکول کو ترجیح نہ دو
دم ہو بازو میں تو ہر ضربِ جنوں ہے کاری
اس جزیرہ میں کہیں نور کا مینار نہیں
جس کے اطراف میں اک قلزمِ خوں ہے جاری
"جوہرِ جامِ جم از کانِ جہانِ دگر است
تُو توقّع زگِلِ کوزہ گراں می داری"

○

گزرا ہوں جس طرف سے بھی پتھر لگے مجھے
ایسے بھی کیا تھے لعل و جواہر لگے مجھے

لو ہو چکی شفا کہ مداوائے دردِ دل
اب تیری دسترس سے بھی باہر لگے مجھے

ترسا دیا ہے ابرِ گریزاں نے اس قدر
برسے جو بوند بھی تو سمندر لگے مجھے

تھامے رہو گے جسم کی دیوار تا بکے
یہ زلزلہ تو روح کے اندر لگے مجھے

گر روشنی یہی ہے تو اے بدنصیب شہر
اب تیرگی ہی تیرا مقدر لگے مجھے

منزل کہاں کی زادِ سفر کو بچائیو!
اب رہزنوں کی نیّتِ رہبر لگے مجھے

وہ مطمئن کہ سب کی زباں کاٹ دی گئی
ایسی خموشیوں سے مگر ڈر لگے مجھے

وہ قحطِ حرفِ حق ہے کہ اس عہد میں فرازؔ
خود سا گنہگار پیمبر لگے مجھے

○

مرے قلم پہ رہی نوک جس کے خنجر کی
سنا ہے اس کی زباں بھی ہوئی ہے پتھر کی

رواں ہے قلزمِ خوں اندرونِ شہر بھی دیکھ
کہ خوشنما تو بہت ہے فصیل باہر کی

اُجاڑ پیڑ گئے موسموں کو روتے ہیں
ہر آبجُو کو ہوس پی گئی سمندر کی

* فقیہہِ شہر جبیں پر کلاہِ زر رکھے
سُنا رہا ہے ہمیں آیتیں مقدّر کی

* خود اپنے خوں میں نہائے ہوئے مگر چپ ہیں
یہ لوگ ہیں کہ چٹانیں ہیں سرخ پتھر کی

وہ ایک شخص کہ سورج کے روپ میں آیا
چرا کے لے گیا شمعیں فراز ہر گھر کی

قاتل

قاتل چُپ ہے
خوں آلودہ ہاتھ میں اب تک
خنجر تھر تھر کانپ رہا ہے
لوگوں کا انبوہ اُسے
گھیرے میں لے کر
چیخ رہا ہے
یہ قاتل ہے
یہ قاتل ہے

خاک اور خوں میں لت پت لاش
کے ہونٹوں پر
اک بات جمی ہے
یہ قاتل ہے
لیکن کس کا
یہ اپنی تخلیق کا قاتل
اس نے خود کو قتل کیا ہے
لوگوں کا انبوہ مگر
کب سُنتا ہے
کون ہے قاتل
کس نے
کس کو قتل کیا ہے؟

نہیں ہے یوں

نہیں ہے یوں کہ مرا دُکھ مری حدود میں ہے
نہ صرف دل ہی دریدہ نہ صرف جاں ہی فگار
نہ صرف دیکھتی آنکھوں میں حسرتوں کا دھواں
نہ صرف ہاتھ شکستہ نہ سر پہ زخم ہزار

جو یوں بھی ہو تو بڑی بات ہے تری قربت
تری وفا تری چاہت تری مسیحائی
ہر ایک زخم کو دھو دے شفیق ہاتھوں سے
ہر ایک درد کو چن لے تری دل آرائی

مگر یہ درد یہ دُکھ کب مری حدود میں ہے
کہاں نہیں مرا پیکر کہاں نہیں یہ فغاں
تو اک وجود کو زندہ تو کر سکے لیکن
ہر اک صلیب پہ میرا ہی جسم آویزاں
ہر ایک تیرِ ستم پر مرا لہو لرزاں
کسے کسے تُو بچائے گی اے مری درماں

○

مزاج ہم سے زیادہ جُدا نہ تھا اُس کا
جب اپنے طور یہی تھے تو کیا گلہ اُس کا

وہ اپنے زعم میں تھا بے خبر رہا مجھ سے
اُسے گماں بھی نہیں میں نہیں رہا اُس کا

وہ برق رَو تھا مگر رہ گیا کہاں جانے
اب انتظار کریں گے شکستہ پا اُس کا

چلو یہ سیلِ بلا خیز ہی بنے اپنا
سفینہ اُس کا، خدا اُس کا، ناخدا اُس کا

یہ اہلِ درد بھی کس کی دُہائی دیتے ہیں
وہ چپ بھی ہو تو زمانہ ہے ہمنوا اُس کا

ہمیں نے ترکِ تعلق میں پہل کی کہ فراز
وہ چاہتا تھا مگر حوصلہ نہ تھا اُس کا

چلو اُسی سے کہیں دل کا حال جو بھی ہو
وہ چارہ گر تو ہے اس کو خیال جو بھی ہو

اُسی کے درد سے ملتے ہیں سلسلے جاں کے
اُسی کے نام لگا دو ملال جو بھی ہو

مرے نہ ہار کے ہم قیس و کوہکن کی طرح
اب عاشقی میں ہماری مثال جو بھی ہو

یہ رہگزر پہ جو شمعیں دمکتی جاتی ہیں
اُسی کا قامتِ زیبا ہے چال جو بھی ہو

فرازؔ اس نے وفا کی کہ بے وفائی کی
جوابدہ تو ہمیں ہیں سوال جو بھی ہو

کُشان بی بی*

تو جب
بمبریت کے قاتل پہاڑوں کی صلیبوں سے اُتر آئے
تو یہ جانا
کہ ہم دشتِ عدم کو پار کر آئے
ہر اک کے پاؤں چھلنی جسم شل
اعضاء تھکن سے چُور
لیکن سب
ہراسِ مرگ سے بے جان — بے حس تھے

* کافرستان کی ایک لڑکی

سبھی یوں زرد رُو جیسے
ابھی تک آسمانوں کے سفر سے لوٹ کر
رُوحیں نہیں آئیں
چلو ہم سب کے سب زندہ ہیں
جیسے بھی ہیں یکجا ہیں
ضیا، باسط، سعید اور میں

ہمارا میزباں کب سے نہ جانے
گھر کے دروازے کھُلے چھوڑے
سبک شہتیر کے پُل پر ہمارا منتظر تھا
اس کو یہ معلوم تھا
ہم اجنبی مہماں
سیاحت کے لیے کن مشکلوں سے
ہفت خواں طے کر کے
اِس وادی میں آئیں گے

چناروں کے بلند اشجار
انگوروں کی بیلیں
چار سُو سبزہ
ہوائیں بید مشک و عود و مُر کی خوشبوؤں سے
چُور بوجھل
طائرانِ خوشنما و خوش نوا — بے کل
سبک رفتار چشموں کی تہوں میں
پتھّروں کا نیلم و یاقوت سا جھل بل
ادھر کچھ دور بُزغالوں کے گلے
نوجواں چرواہیوں کے دودھیا چہروں کی صورت
برف سے شفاف و دل آرا
فضا حیرت فزا — سحر آفریں دنیا
"مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را"

ہمارا میزباں مفلس تھا
لیکن شام کو خوانِ ضیافت دیکھ کر
ہم خس بدنداں تھے
کشادہ طشت میں بزغالۂ بریاں
بطک میں آبِ تاک
اور کشتیوں میں ڈھیر سیبوں کے
الاؤ میں دہکتی آگ
کتنی گرم کتنی خوبصورت تھی

مگر ہم منتظر اس پل کے تھے
جب کافرستاں کی جواں پریاں
زمینی خلد کی حوریں
دف و مردنگ کی تھاپوں پہ رقصاں
اپنے محبوبوں کی فرقت کے

نشیلے گیت گائیں گی
الف لیلہ کے شہزادوں کی صورت
ہم میں ہر اک
اس طلسماتی فضا کے سحر میں گُم تھا
بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
سیہ ملبوس میں لپٹے ہوئے
مرمر کے بُت
مہتاب سے پیکر
سبھی باہوں میں باہیں ڈال کر زنجیر کی صورت
کماں کی شکل میں جُنباں
کہ جیسے دیوتاؤں کے رتھوں کی گھوڑیاں
وحشت سے پاکوباں
دف و دمامہ و مردنگ کے آہنگ میں
آہستہ آہستہ
کھنکتے قہقہے — مجوب آوازیں بھی

شامل ہو گئیں آخر
کہ جیسے نقرئی گھنگرو
اچانک جھنجھنا اُٹھیں
سبھی غارت گرِ تمکین و ہوش و دشمنِ ایماں
ہر اک فتنہ گرِ دوراں
مگر وہ سر گروہِ نازنیناں
غیرتِ ناہید
جانِ حلقۂ خوباں
کشان بی بی
قد و قامت قیامت
جُنبشیں جادو
بدن طوفاں

ضیا کردار میں گو تم
مجسّم صدق و ایثار و وفا

درد آشنا و نفس کُش ہمدم
لہو اس کا بھی اس شعلے نے گرمایا
مگر سب ساتھیوں سے کم

بتانِ آذری رقصاں
مگر باسط جو اک فنکار
لیکن شکوہ سنجِ زندگی ہر دم
قلم اس کا دُر افشاں و گہر تحریر
لیکن خود تہی داماں
شکستہ دل
خود اپنے فن سے اپنے آپ سے نالاں
یہاں دنیا کے غم بھُولا ہُوا
بسمل
ہر اک پیکر پہ سو سو جان سے قرباں

سعید اک کم نظر جذبات کا پُتلا
مہندس
اور فقط جسموں کا سوداگر
جو اپنے ساتھیوں سے بھی چھپا کر ساتھ لایا تھا
کئی تحفے
ملمع کی ہُوئیں انگوٹھیاں
جھوٹے نگوں کے ہار
دل آویز آویزے
کسی ماہر شکاری کی طرح
اپنی کمند و دام پر نازاں
ہر اک پر سحر طاری تھا
بتانِ آذری کا رقص جاری تھا

ضیا حیرت میں گم

باسط زخود رفتہ
سعید افسوں زدہ
میں بُت
کشان بی بی کے لب
کلیوں کی صورت نیم وا
اور ہم فقط
آواز کی خوشبو سے پاگل
لذتِ معنی سے نامحرم
زبانِ یار کیلاشی و ما از حرفِ بیگانہ
(ہمارے میزباں نے ترجمانی کی)
کشان بی بی یہ کہتی ہے
"مرے محبوب تو اک دستۂ مُر ہے
کہ جو راتوں کو میری چھاتیوں کے درمیاں
خوشبو لُٹاتا ہے
مری ہمجولیو!

بستی کے سارے نوجوانوں میں
مرا محبوب پیارا
جس طرح بن کے درختوں میں ہو نخلِ سیب استادہ
مرا محبوب
جیسے جھاڑیوں کے درمیاں کوئی گلِ سوسن
مرا محبوب مجھ سے کل ملا تھا
اُس نے مجھ سے خوب باتیں کیں
وہ کہتا تھا کہ اے میری پری
اے نازنین
اب تو مری بستی کو میرے ساتھ چل
برسات کا موسم چلا
بادل برس کر کھل چکے
انگور اور سیبوں کی مٹی جاگ اُٹھی
اے کوہساروں کی چکوری
تو نہ جانے کن پہاڑوں کی دراڑوں میں چھپی ہے

آ مرے ہمراہ چل پیاری

بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
فضا پر سحر طاری تھا
ہر اک کی آنکھ میں تل کی طرح
وہ کافرستان کی قلوپطرہ
مگر ہم میں کوئی سیزر نہ انتونی
ضیا گوتم سہی
لیکن گشن بی بی
وہ کافر جو ضیا کو بھی نہ سونپی جائے ہے مجھ سے
نہ جانے کس طرح یہ شب ڈھلی
لیکن سحر دم
جب پرندوں کے چہکنے کی صدا آئی
کشان بی بی
سیہ ملبوس میں لپٹی

جبیں پر کوڑیوں کا تاج
گالوں پر گھنی زلفیں
کنیزوں کی طرح اپنی رفیقوں کو لیے
رخصت ہوئی ہم سے
بصد اندازِ استغنا و دارائی
تو ہم سارے تماشائی تھے پتھر
اور پتھر تھے تماشائی

○

تڑپ اٹھوں بھی تو ظالم تری دہائی نہ دوں
میں زخم زخم ہوں پھر بھی تجھے دکھائی نہ دوں

ترے بدن میں دھڑکنے لگا ہوں دل کی طرح
یہ اور بات کہ اب بھی تجھے سنائی نہ دوں

خود اپنے آپ کو پرکھا تو یہ ندامت ہے
کہ اب کبھی اسے الزام بے وفائی نہ دوں

مری بقا ہی مری خواہشِ گناہ میں ہے
میں زندگی کو کبھی زہرِ پارسائی نہ دوں

جو ٹھن گئی ہے تو یاری پہ حرف کیوں آئے
حریفِ جاں کو کبھی طعنِ آشنائی نہ دوں

مجھے بھی ڈھونڈ کبھی محوِ آئینہ داری
میں تیرا عکس ہوں لیکن تجھے دکھائی نہ دوں

یہ حوصلہ بھی بڑی بات ہے شکست کے بعد
کہ دوسروں کو تو الزامِ نارسائی نہ دوں

فراز دولتِ دل ہے متاعِ محرومی
میں جامِ جم کے عوض کاسۂ گدائی نہ دوں

خواب جھوٹے خواب

خواب جھوٹے خواب میرے خواب تیرے خواب بھی
درد کی لذّت بھی دھوکا قرب کا غم بھی فریب
بے قراری بھی نمائش خام یارائے شکیب
تشنگی کی آگ بھی قاتل شرابِ ناب بھی

میں نے جس دریا کی وسعت دیکھ کر چاہا اُسے
وہ تو میری موجۂ غم سے بھی تھا پایاب تر
تُو بڑھی جن ساحلوں کی سمت مجھ کو دیکھ کر
تشنگی اُن کی بجھا سکتی نہیں سیلاب بھی

واہموں میں مبتلا ہم آج تک سمجھا کیے
تیرا آئینہ بھی سورج میرے پتھر بھی گلاب
آؤ اب تسلیم کر لیں سب غلط باتیں کہیں
کاغذی ہیں پھول میرے تیرے دریا بھی سراب
خواب جھوٹے خواب میرے خواب تیرے خواب بھی

آئینہ

تجھ سے بچھڑا ہوں تو آج آیا مجھے اپنا خیال
ایک قطرہ بھی نہیں باقی کہ ہوں پلکیں تو نم
میری آنکھوں کے سمندر کون صحرا پی گئے
ایک آنسو کو ترستی ہے مری تقریبِ غم

میں نہ رو پایا تو سوچا مسکرا کر دیکھ لوں
شاید اس بے جان پیکر میں کوئی زندہ ہو خواب
پر لبوں کے تن برہنہ شاخچوں پر اب کہاں
مسکراہٹ کے شگوفے خندۂ دل کے گلاب

کتنا ویراں ہو چکا ہے میری ہستی کا جمال
تجھ سے بچھڑا ہوں تو آج آیا مجھے اپنا خیال

○

درد کی راہیں نہیں آساں ذرا آہستہ چل
اے سبک رو اے حریفِ جاں ذرا آہستہ چل

منزلوں پر قرب کا نشہ ہوا ہو جائے گا
ہمسفر وہ ہے تو اے ناداں ذرا آہستہ چل

نامرادی کی تھکن سے جسم پتھر ہو گیا
اب سکت کیسی دلِ ویراں ذرا آہستہ چل

جام سے لب تک ہزاروں لغزشیں ہیں خوش نہ ہو
اب بھی محرومی کا ہے امکاں ذرا آہستہ چل

ہر تھکا ہارا مسافر ریت کی دیوار ہے
اے ہوائے منزلِ جاناں ذرا آہستہ چل

اس نگر میں زلف کا سایہ نہ دامن کی ہوا
اے غریبِ شہرِ ناپرساں ذرا آہستہ چل

آبلہ پا تجھ کو کس حسرت سے تکتے ہیں فرازؔ
کچھ تو ظالم پاسِ ہمراہاں ذرا آہستہ چل

○

گلہ نہ کر دلِ ویراں کی ناسپاسی کا
ترا کرم ہی سبب بن گیا اداسی کا

ملول کر گئی ویران ساعتوں کی صدا
چمن میں جی نہ لگا جنگلوں کے باسی کا

بھرم کھلا ہے کہ جب اس سے ہم کلام ہوئے
ہمیں بھی زعم تھا پیارے سخن شناسی کا

شکستِ عہد کوئی ایسا سانحہ تو نہ تھا
تجھے بھی رنج ہوا بات اک ذرا سی کا

فراز آج شکستہ پڑا ہوں بُت کی طرح
میں دیوتا تھا کبھی ایک دیو داسی کا

نذرِ نذرل*

فنکار جو اپنے سحرِ فن سے
پتھّر کو زبان بخشتا ہے
الفاظ کو ڈھال کر صدائیں
آواز کو جان بخشتا ہے
تاریخ کو اپنا خون دے کر
تہذیب کو شان بخشتا ہے

* نذر الاسلام

فنکار خموش ہو تو جابر
ظلمت کے نشان کھولتا ہے
ہر اہلِ نظر کو دستِ قاتل
نیزے کی انی پہ تولتا ہے
انسان بزورِ خاک و خوں میں
انساں کے حقوق رولتا ہے

فنکار اگر زباں نہ کھولے
انبارِ گہر نصیب اُس کا
ورنہ ہر شہریار دشمن
ہر شیخِ حرم رقیب اُس کا
چاہے وہ فراز ہو کہ نذرل
بولے تو صلہ صلیب اُس کا

○

صحرا تو بوند کو بھی ترستا دکھائی دے
بادل سمندروں پہ برستا دکھائی دے

اس شہرِ غم کو دیکھ کے دل ٹوٹنے لگا
اپنے پہ ہی سہی کوئی ہنستا دکھائی دے

اے صدرِ بزم مے تری ساقی گری کی خیر
ہر دل بسانِ شیشہ شکستہ دکھائی دے

گر مے نہیں تو زہر ہی لاؤ کہ اس طرح
شاید کوئی نجات کا رستہ دکھائی دے

اے چشمِ یار تُو بھی تو کچھ دل کا حال کھول
ہم کو تو یہ دیار نہ بستا دکھائی دے

جنسِ ہنر کا کون خریدار ہے فراز
ہیرا، کہ پتھّروں سے بھی سستا دکھائی دے

○

یہ دل کا چور کہ اس کی ضرورتیں تھیں بہت
وگرنہ ترکِ تعلّق کی صورتیں تھیں بہت

ملے تو ٹوٹ کے روئے نہ کھُل کے باتیں کیں
کہ جیسے اب کے دلوں میں کدورتیں تھیں بہت

بھُلا دیے ہیں ترے غم نے دُکھ زمانے کے
خدا نہیں تھا تو پتھّر کی مورتیں تھیں بہت

دریدہ پیرہنوں کا خیال کیا آتا؟
امیرِ شہر کی اپنی ضرورتیں تھیں بہت

فراز دل کو نگاہوں سے اختلاف رہا
وگرنہ شہر میں ہم شکل صورتیں تھیں بہت

چلو اُس بُت کو بھی رو لیں

چلو اُس بُت کو بھی رو لیں
جسے سب نے کہا پتھّر
مگر ہم نے خدا سمجھا
خدا سمجھا
کہ ہم نے پتھّروں میں عمر کاٹی تھی
کہ ہم نے معبدوں کی خاک چاٹی تھی

کہ پتھّر تو کہیں دیوارِ زنداں
اور کہیں دہلیزِ مقتل تھے
کبھی سرمایۂ دامانِ خلقت
اور کبھی بختِ جنوں کیشاں
کبھی ان کا ہدف دکانِ شیشہ گر
کبھی صورت گرِ ہنگامۂ طفلاں
کبھی بے نور آنکھوں کے نشاں
بے اشک، بے ارماں
کبھی لوحِ مزارِ جاں
نہ چارہ گر نہ اہلِ درد کے درماں
مگر وہ بُت
چراغِ بزمِ تنہائی
مجسّم رنگ و رعنائی
فضا کی روشنی
آنکھوں کی بینائی

سکونِ جاں

وہ آنکھیں درد کی جھیلیں
وہ لب چاہت کے شعلوں سے بھرے مرجاں
وہ بُت انساں
مگر ہم نے وفورِ شوق میں
فرطِ عقیدت سے کہا یزداں
یہ ہم کافر
کہ دنیا کم نظر ناداں

سبھی لائے ہمارے سامنے اوراقِ پارینہ
کہ جن پر نقش تھے
اہلِ وفا کے عکسِ دیرینہ
شکستہ استخواں بے جان نابینا
جبیں سجدوں سے داغی
اور زخموں سے بھرا سینہ

اور ان کے بُت
ناں سوزِ اہلِ دل سے بے پروا
سبھی خود بین و خود آرا
ہر اک محمل نشیں تنہا
مگر مصروفِ نظّارا

اور اب ہم بھی گرفتہ دل
نہ محرومی کو سہہ پائیں
نہ بربادی چھپانے کے رہے قابل
وہ بُت مرمر کی سِل
اور اہلِ سجدہ کی جبیں گھائل
سبھی کی بات سچ
اور ہم ندامت کے عرق میں تر بتر
شرمندگی کے کرب سے بسمل

چلو اب اپنے جیسے نامرادوں سے ہنسیں، بولیں
جو وہ کہتے ہیں وہ ہو لیں
جبیں کے داغ آنکھوں کا لہو دھولیں
چلو اِس بُت کو بھی رو لیں

○

سائے کی طرح نہ خود سے رم کر
دیوار کو اپنا ہم قدم کر

اپنے ہی لیے بہا نہ دریا
اوروں کے لیے بھی آنکھ نم کر

تکمیلِ طلب نہیں ہے منزل
طے راہِ وفا قدم قدم کر

اے پچھلی رُتوں کو رونے والے
آنے والے دنوں کا غم کر

ممکن ہو تو تیشۂ ہنر سے
ہر پارۂ سنگ کو صنم کر

ہے چشم براہ ایک دنیا
پتّھر کی طرح نہ بیٹھ جم کر

یہ راہِ جنوں ہے اس میں پیارے
ممکن ہو تو احتیاط کم کر

اے قصرِ جہاں یہ تیرا معمار
تُو ہاتھ فراز کے قلم کر

○

دولتِ درد کو دنیا سے چھپا کر رکھنا
آنکھ میں بوند نہ ہو دل میں سمندر رکھنا

کل گئے گزرے زمانوں کا خیال آئے گا
آج اتنا بھی نہ راتوں کو منوّر رکھنا

اپنی آشفتہ مزاجی پہ ہنسی آتی ہے
دشمنی سنگ سے اور کانچ کا پیکر رکھنا

آس کب دل کو نہیں تھی ترے آجانے کی
پر نہ ایسی کہ قدم گھر سے نہ باہر رکھنا

ذکر اس کا سہی بزم میں بیٹھے ہو فراز
درد کیسا ہی اُٹھے ہاتھ نہ دل پر رکھنا

خُوں بہا

اُجرتی قاتل کی صورت
بے حس و بے درد لمحوں کا خدا
آج پہلی بار جیسے قتل کر کے
سخت شرمندہ ہُوا

بے گناہی کے لہو میں تر بتر
معصومیت کی راکھ میں لت پت
تڑپتی آرزو چیخی
کہ آخر کس عداوت کس ارادے
کس خطا کی یہ سزا

ایک منعم کی طرح
اُجرتی قاتل نے میرے سامنے
بکھرے ہُوئے اوراق پر
لفظوں کے کچھ لعل و گہر
یاقوت و مرجاں — رکھ دیے
لو خوں بہا
اور میں مقتول کے مجبور وارث کی طرح
چپ ہو گیا

نوحہ

اگرچہ مرگِ وفا بھی اک
سانحہ ہے لیکن یہ بے حسی
اس سے بڑھ کے جانکاہ ہے
کہ جب ہم خود اپنے ہاتھوں
سے اپنی چاہت کو نامرادی
کے ریگ زاروں میں دفن
کر کے جُدا ہُوئے تو نہ
تیری پلکوں پہ کوئی آنسو
لرز رہا تھا نہ میرے ہونٹوں
پہ کوئی جاں سوز مرثیہ تھا

○

یاد آتا ہے تو کیوں اُس سے گلہ ہوتا ہے
وہ جو اک شخص ہمیں بھول چکا ہوتا ہے

ہم ترے لطف سے نادم ہیں کہ اکثر اوقات
دل کسی اور کی باتوں سے دُکھا ہوتا ہے

مل گئے ہو تو چلو رسمِ زمانہ ہی سہی
ورنہ اب پُرسشِ احوال سے کیا ہوتا ہے

اِس قدر زہر نہ تھا طنزِ حریفاں پہلے
اب تو کچھ خندۂ یاراں سے سوا ہوتا ہے

سادہ دل چارہ گروں کو نہیں معلوم فراز
بعض اوقات دلاسا بھی بلا ہوتا ہے

چاند اور میں

چاند سے میں نے کہا ! اے مری راتوں کے رفیق
تو کہ سرگشتہ و تنہا تھا سدا میری طرح

اپنے سینے میں چھپائے ہُوئے لاکھوں گھاؤ
تو دکھاوے کے لیے ہنستا رہا میری طرح

ضوفشاں حسن ترا میرے ہُنر کی صورت
اور مقدّر میں اندھیرے کی ردا میری طرح

وہی تقدیر تری میری زمیں کی گردش
وہی افلاک کا نخچیرِ وفا میری طرح

وہی صحرائے شبِ زیست میں تنہا سفری
وہی ویرانۂ جاں دشتِ بلا میری طرح

آج کیوں میری رفاقت بھی گراں ہے تجھ کو
تو کبھی اتنا بھی افسردہ نہ تھا میری طرح

چاند نے مجھ سے کہا ! اے میرے پاگل شاعر
تو کہ محرم ہے مرے قریۂ تنہائی کا

تجھ کو معلوم ہے جو زخم مری روح میں ہے
مجھ کو حاصل ہے شرف شناسائی کا

موجزن ہے مرے اطراف میں اک بحرِ سکوت
اور چرچا ہے فضا میں تیری گویائی کا

آج کی شب مرے سینے پہ وہ قابیل اترا
جس کی گردن پہ دمکتا ہے لہو بھائی کا

میرے دامن میں نہ ہیرے ہیں نہ سونا چاندی
اور بجز اس کے نہیں شوقِ تمنّائی کا

مجھ کو دُکھ ہے کہ نہ لے جائیں یہ دُنیا والے
میری دنیا ہے خزانہ میری تنہائی کا

وارفتگی میں دل کا چلن انتہا کا تھا
اب بُت پرست ہے جو نہ قائل خدا کا تھا

مجھ کو خود اپنے آپ سے شرمندگی ہوئی
وہ اس طرح کہ تجھ پہ بھروسہ بلا کا تھا

وار اس قدر شدید کہ دشمن ہی کر سکے
چہرہ مگر ضرور کسی آشنا کا تھا

اب یہ کہ اپنی کشتِ تمنّا کو روئیے
اب اس سے کیا گلہ کہ وہ بادل ہوا کا تھا

تُو نے بچھڑ کے اپنے سر الزام لے لیا
ورنہ فراز کا تو یہ رونا سدا کا تھا

سہرا

یوں بھی ہوتا ہے برسوں کے دو ہمسفر
اپنے خوابوں کی تعبیر سے بے خبر
اپنے عہدِ محبّت کے نشّے میں گم
اپنی قسمت کی خوبی پہ نازاں مگر
زندگی کے کسی موڑ پر کھو گئے
اور اک دوسرے سے جُدا ہو گئے

یوں بھی ہوتا ہے دو اجنبی راہ رو
اپنی راہوں سے منزل سے ناآشنا
ایک کو دوسرے کی خبر تک نہیں
کوئی پیمانِ الفت نہ عہدِ وفا
اتفاقات سے اس طرح مل گئے
ساز بھی بج اُٹھے پھول بھی کھل گئے

لگا کے زخم بدن پر قبائیں دیتا ہے
یہ شہر یار بھی کیا کیا سزائیں دیتا ہے

تمام شہر ہے مقتل اُسی کے ہاتھوں سے
تمام شہر اُسی کو دعائیں دیتا ہے

کبھی تو ہم کو بھی بخشے وہ ابر کا ٹکڑا
جو آسمان کو نیلی ردائیں دیتا ہے

جدائیوں کے زمانے پھر آ گئے شاید
کہ دل ابھی سے کسی کو صدائیں دیتا ہے

چلے تھے یار بڑے زُعم میں ہوا کی طرح
پلٹ کے دیکھا تو بیٹھے ہیں نقشِ پا کی طرح

مجھے وفا کی طلب ہے مگر ہر اک سے نہیں
کوئی ملے مگر اس یارِ بے وفا کی طرح

مرے وجود کا صحرا ہے منتظر کب سے
کبھی تو آ جرسِ غنچہ کی صدا کی طرح

ٹھہر گئی ہے محبت کہاں کہ مدت سے
نہ ابتدا کی طرح ہے نہ انتہا کی طرح

وہ اجنبی تھا تو کیوں مجھ سے پھیر کر آنکھیں
گزر گیا کسی دیرینہ آشنا کی طرح

فراز کس کے ستم کا گلہ کریں کس سے
کہ بے نیاز ہوئی خلق بھی خدا کی طرح

اگر یہ سب کچھ نہیں .....

ملے تو ہم آج بھی ہیں لیکن
نہ میرے دل میں وہ تشنگی تھی
کہ تجھ سے مل کر کبھی نہ بچھڑوں
نہ آج تجھ میں وہ زندگی تھی
کہ جسم و جاں میں اُبال آئے
نہ خواب زاروں میں روشنی تھی

نہ میری آنکھیں چراغ کی لو
نہ تجھ میں ہی خود سپردگی تھی
نہ بات کرنے کی کوئی خواہش
نہ چُپ ہی میں خوبصورتی تھی
مجسموں کی طرح تھے دونوں
نہ دوستی تھی نہ دشمنی تھی

مجھے تو کچھ یوں لگا ہے جیسے
وہ ساعتیں بھی گزر گئی ہیں
کہ جن کو ہم لازوال سمجھے
وہ خواہشیں بھی تو مر گئی ہیں
جو تیرے میرے لہو کی حدّت
کو آخرش برف کر گئی ہیں
محبتیں شوق کی چٹانوں
سے گھاٹیوں میں اُتر گئی ہیں

وہ قربتیں وہ جدائیاں سب
غبار بن کر بکھر گئی ہیں
اگر یہ سب کچھ نہیں تو بتلا
وہ چاہتیں اب کدھر گئی ہیں

یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی حالتیں کرنی
فراز تجھ کو نہ آئیں محبتیں کرنی

یہ قرب کیا ہے کہ تو سامنے ہے اور ہمیں
شمار ابھی سے جُدائی کی ساعتیں کرنی

کوئی خدا ہو کہ پتھّر جسے بھی ہم چاہیں
تمام عمر اُسی کی عبادتیں کرنی

سب اپنے اپنے قرینے سے منتظر اس کے
کسی کو شکر کسی کو شکایتیں کرنی

ہم اپنے دل سے ہیں مجبور اور لوگوں کو
ذرا سی بات پہ برپا قیامتیں کرنی

ملیں جب اُن سے تو مبہم سی گفتگو کرنا
پھر اپنے آپ سے سو سو وضاحتیں کرنی

یہ لوگ کیسے مگر دشمنی نباہتے ہیں
ہمیں تو راس نہ آئیں محبّتیں کرنی

کبھی فراز نئے موسموں میں رو دینا
کبھی تلاش پُرانی رفاقتیں کرنی

○

فقیہِ شہر کی مجلس سے کچھ بھلا نہ ہُوا
کہ اس سے مل کے مزاج اور کافرانہ ہُوا

ابھی ابھی وہ مِلا تھا ھزار باتیں کیں
ابھی ابھی وہ گیا ہے مگر زمانہ ہُوا

وہ رات بھُول چکو وہ سخن نہ دھراؤ
وہ رات خواب ہُوئی وہ سخن فسانہ ہُوا

کچھ اب کے ایسے کڑے تھے فراق کے موسم
تری ہی بات نہیں میں بھی کیا سے کیا نہ ہُوا

ہجوم ایسا کہ راہیں نظر نہیں آتیں
نصیب ایسا کہ اب تک تو قافلہ نہ ہُوا

شہیدِ شب فقط احمد فراز ہی تو نہیں
کہ جو چراغ بکف تھا وہی نشانہ ہُوا

ویتنام

مجھے یقیں ہے
کہ جب بھی تاریخ کی عدالت میں
وقت لائے گا
آج کے بے ضمیر و دیدہ دلیر قاتل کو
جس کے دامان و آستیں
خون بے گناہاں سے تر بتر ہے

تو نسلِ آدم
وفورِ نفرت سے رُوئے قاتل پہ تھوک دے گی
مگر مجھے اس کا بھی یقیں ہے
کہ کل کی تاریخ
نسلِ آدم سے یہ بھی پوچھے گی
اے مہذّب جہاں کی مخلوق
کل ترے رُوبرو یہی بے ضمیر قاتل
ترے قبیلے کے بے گناہوں کو
جب تہہِ تیغ کر رہا تھا
تو تُو تماشائیوں کی صورت
خموش و بے حس
درندگی کے مظاہرے میں شریک
کیوں دیکھتی رہی ہے
تری یہ سب نفرتیں کہاں تھیں

بتا کہ اس ظلم کیش قاتل کی تیغ براں میں
اور تری مصلحت کے تیروں میں
فرق کیا ہے ؟
تو سوچتا ہوں
کہ ہم سبھی کیا جواب دیں گے



فراز کی شاعری غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا ایک حسین سنگم ہے۔ ان کی غزلیں اس تمام کرب و الم کی غمازی کرتی ہیں جس سے ایک حساس اور رومانٹک شاعر کو دو چار ہونا پڑتا ہے۔ ان کی نظمیں غمِ دوراں کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں اور ان کی کہی ہوئی بات "جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے"۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

ISBN : 969-496-079-7